اکائی 9 قصیدہ 'دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں' کی تدریس

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 قصیدہ کسے کہتے ہیں

9.4 زیرتدریس قصیدہ کا متن

9.5 زیرتدریس قصیدہ کی تشریح وتعبیر

9.6 آپ نے کیا سیکھا

9.7 اپنا امتحان خود لیجیے

9.8 سوالات کے جوابات

9.9 فرہنگ

9.10 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ کو یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ

- قصیدہ کسے کہتے ہیں؟
- اردو قصیدہ نگاری میں غالب کی کیا اہمیت ہے؟
- غالب کے زیرتدریس قصیدہ کی تشریح وتعبیر کرکے آپ کے اندر کسی بھی قصیدہ کو سمجھنے کی صلاحیت کیسے پیدا کریں۔

9.2 تمہید

اردو کی دیگر شعری اصناف کی طرح قصیدہ بھی ایک صنف ہے۔اس کے ذریعے عام طور پر کسی کی تعریف یا برائی کی جاتی ہے۔اردو میں یہ صنف سخن فارسی سے لی گئی ہے جبکہ فارسی میں یہ صنف عربی سے داخل ہوئی۔ انقلاب اٹھارہ سوستاون سے قبل اردو میں قصیدے بڑی تعداد میں لکھے جاتے تھے لیکن اس کے بعد اس صنف پر زوال کے بادل منڈلانے لگے تھے۔بدلے ہوئے حالات میں اردو شاعری کے نت نئے اصول وضوابط مقرر ہونے لگے تھے۔خصوصاً حالی جیسے ناقدین قصیدے میں

سلاست وسادگی اور حقیقی تعریف یا برائی کو داخل کرنا چاہتے تھے جسے قصیدہ جیسی شعری صنف قبول نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجتاً یہ صنف زوال آمادہ ہوگئی لیکن اس میں مستعمل پُرشکوہ الفاظ، انداز بیان کی رفعت اور زور تخیل وغیرہ کے سبب آج بھی ہماری کلاسیکی شعری اصناف میں ایک اعلا مقام رکھتی ہے۔

9.3 قصیدہ کسے کہتے ہیں

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ 'گاڑھا مغز' ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ لفظ قصیدہ، قصد سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہے 'ارادہ کرنا'۔ لیکن اصطلاح میں قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں۔ ردیف کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بغیر ردیف کے بھی قصیدے لکھے جا سکتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں کسی کی مدح یا تعریف یا کسی کی ہجو یا برائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر قصیدہ کے پانچ اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں: تشبیب، گریز، مدح، مدعا اور دعا۔ تشبیب سے وہ اشعار مراد لیے جاتے ہیں جو قصیدے کی ابتدا میں تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ مطلع بلند پایہ اور شگفتہ ہونا چاہیے۔ تشبیب میں ہر طرح کے مضامین مثلاً موسم بہار، واردات حسن و عشق، فلسفہ و حکمت، دنیا کی بے ثباتی اور زمانے کی شکایت وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ تشبیب کے بعد قصیدہ نگار مدح کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ وہ براہ راست ممدوح کی تعریف نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے چند ایسے اشعار پیش کرتا ہے جس سے تشبیب اور مدح کے درمیان ایک منطقی ربط پیدا ہو جائے۔ اسی کو گریز کہا جاتا ہے۔ گریز کے بعد شاعر مدح کی جانب آتا ہے اور اس میں ممدوح کی تعریف کے لیے پرشکوہ الفاظ کا استعمال کرتا ہے اور خوب مبالغے سے کام لیتا ہے۔ قصیدے کا چوتھا جز مدعا یا حسن طلب ہے۔ اس میں شاعر اپنے ذاتی حالات اور اغراض و مقاصد بیان کرتا ہے۔ اس موقع پر ممدوح کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے کچھ اس طرح اپنا مطلب بیان کرتا ہے جس سے ممدوح قصیدہ نگار کے مدعا یا حسن طلب کو بخوشی گوارہ کر لے۔ قصیدہ کا پانچواں اور آخری جز دعا ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کی درازیِ عمر، شان و شوکت اور مال و دولت وغیرہ میں اضافہ کے لیے دعا دیتا ہے۔

9.4 زیر تدریس قصیدہ کا متن

1 دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
2 بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
3 ہَرزَہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
4 نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت — سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
5 لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
6 مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم — صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

7 عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس   وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

8 کوہکن گُرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب   بیستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

9 کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز   کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں

10 سامع زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن   نہ سرو برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

11 کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ   یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

12 نقش لاحول لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر   یا علی! عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں

13 مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رُسُل   قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

14 ہو وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام   ہر کف خاک ہو واں، گردۂ تصویرِ زمیں

15 جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا   وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

16 نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے   ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

17 فیضِ خُلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا   بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

18 بُرِشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا   قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں

19 کفرسوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے   رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

20 جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!   وصیِ ختمِ رُسُل تو ہے بہ فتوائے یقیں

21 جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر   نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

22 کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب   شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

23 آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ   رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

24 تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ   خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

25 تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں   تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

26 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا   کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

27 جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسد   کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

28 شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب   ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

29 دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول   کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

30 غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز   کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

31 طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق   کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

32 دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا   نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

33 صَرفِ اَعدا اثرِ شعلہ و دُودِ دوزخ   وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

9.5 زیرتدریس قصیدہ کی تشریح وتعبیر

زیرتدریس قصیدہ غالب کے بہترین قصائد میں شمار ہوتا ہے۔اس کا پہلا شعر مطلع ہے۔اس میں غالب نے وحدۃ الوجود کے مضمون کو پیش کیا ہے۔اس کے پہلے مصرعے میں وہ کہتے ہیں کہ زمانہ یعنی پوری کائنات معشوق حقیقی یعنی خدا کے جلوے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔دراصل یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا عکس ہے۔جبکہ دوسرے مصرعے میں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے جلوؤں کو دیکھنا مطلوب تھا اس لیے اس نے کائنات اور دیگر مخلوقات کو پیدا کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خود بینی نہیں ہوتی تو اس کائنات کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

قصیدہ کے دوسرے شعر میں غالب نے دنیا اور دنیا کی تمام اشیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ان کے مطابق تماشا یعنی مشاہدے سے عبرت حاصل ہوتی ہے یا لطف وانبساط حاصل ہوتا ہے۔لیکن مجھ پر اس قدر بیدلی طاری ہے کہ کسی منظر کو دیکھ کر نہ عبرت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی لطف ہاتھ آتا ہے۔نتیجتاً نہ مجھے اب دنیا کی خواہش ہے اور نہ ہی دین کی مجھ میں تمنا اور آرزو رہ گئی ہے۔یعنی اب میں دونوں دنیا کی آرزو سے فارغ ہو چکا ہوں۔

تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت زندگی اور موت ہے۔دنیا والے اسے کسی نغمے کے زیر و بم سے تشبیہ دیا کرتے ہیں جبکہ میرے نزدیک یہ نغمہ یعنی موت وحیات بے حقیقت ہے۔اسی طرح دوسرے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ دنیا والے دیوانگی کے مقابلے میں فرزانگی کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان فرق کرنے والا آئینہ ہی لغو یعنی بے معنی اور بے کار ہے۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ جس چیز کو لوگ معنی کے نقوش کا نام دیتے ہیں، وہ صورت کی پیشکش کی ایک انگڑائی کے علاوہ کچھ نہیں۔اسی طرح دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ جو لوگ سخن حق یعنی حق بات کے طرف دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ بھی میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔کیونکہ حق و باطل کوئی حقیقی چیزیں نہیں ہیں بلکہ لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں، اسے حق کا نام دیتے ہیں اور جسے ناپسند کرتے ہیں، اسے باطل قرار دیتے ہیں۔

پانچویں شعر میں غالب نے دانشوری، حکمت اور زہد و پرہیز گاری دونوں کا مذاق اڑایا ہے۔ان کے مطابق دانشمندی کی ڈینگیں مارنا غلط اور عبادت کا نفع معدوم ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا ہو یا دین، وہ غفلت اور نادانی کے ایک ساغر کی تلچھٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

چھٹے شعر کے پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ جس طرح عاشقوں کو وفاداری سے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح شیوۂ تسلیم و رضا سے بھی کچھ ملنے والا نہیں ہے۔اور دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ

جس طرح نقش قدم کے سر پر خاک پڑی رہتی ہے، اسی طرح غرور اور ناز کا سر بھی ہمیشہ خاک آلود ہی رہتا ہے۔ اس شعر کے ذریعے غالب کہنا چاہتے ہیں کہ تسلیم ہو یا تمکین دونوں بے سود اور بے فائدہ ہیں۔

ساتویں شعر کے پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں کہ حواس کے اجزا کے بندھن کے بے ربط ہو جانے کا نام عشق ہے۔ یعنی جب حواس خلل پذیر ہو جاتے ہیں تو اس کا اظہار عشق کی صورت میں ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں وہ کہتے ہیں کہ وصل حسنِ یقین کے آئینے کا زنگ ہے۔ یعنی عشق کو اگر حسن یقین کا آئینہ کہیں تو وصل اس کے لیے زنگ کی طرح ہے۔ یعنی جس طرح آئینۂ جلبی، زنگ آلود ہو کر اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے، اسی طرح وصل، عشق کی قدر و قیمت کو زائل کر دیتا ہے۔

آٹھویں شعر میں غالب نے کہا ہے کہ فرہاد جسے دنیا میں ایک مثالی عاشق تصور کیا جاتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے رقیب کے عشرت کدے کا ایک بھوکا مزدور تھا۔ اسی طرح شیریں کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ بھی کوئی مثالی معشوقہ نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنے عاشق کی طرف سے تغافل کی گہری نیند سوتی رہی، ایسی گہری نیند جس کی گرانی کی تمثیل، کوہِ بے ستوں سے پیش کی جا سکتی ہے۔

نویں شعر میں غالب نے کہا ہے کہ اہل وفا کی سانس کو کس نے سوز دل کی وجہ سے آتش خیز ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ علاوہ ازیں غمزدہ دلوں کے نالے کا اثر کس نے پایا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ محض دعویٰ ہے۔ اہل وفا کی سانس کو کسی نے آتش خیز ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور نہ ہی غمزدہ دلوں کے نالوں کا اثر پایا جاتا ہے۔

دسواں شعر اس قصیدہ کی تشبیب کا آخری شعر ہے۔ اس میں غالب نے دنیا سے اپنی لاتعلقی کا اظہار ایک انوکھے انداز میں کیا ہے۔ ان کے مطابق دنیا والوں کا زمزمہ سنتا رہتا ہوں۔ یعنی ان کی نت نئی آوازیں میرے کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ لیکن نہ تو مجھے کسی کی تعریف کا خیال ہے اور نہ ہی کسی سے نفرت کی تاب ہے۔

اس قصیدے کا آغاز اگرچہ فلسفۂ وحدۃ الوجود سے کیا گیا ہے لیکن بعد کے اشعار میں دنیا سے اپنی بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ تشبیب کے آخری شعر میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔ آغاز اور اختتام میں مضمون کی تکرار و یکسانیت کے باوجود قارئین ان اشعار سے محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ حسن مطلع میں غالب نے دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار باصرہ کے تلازموں اور آخری شعر سامعہ کے تلازموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

قصیدہ کا گیارہواں اور بارہواں شعر گریز کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اول الذکر شعر میں صنعت رجوع سے کام لیتے ہوئے غالب خود سے کہتے ہیں کہ اللہ کی پناہ میں کس قدر بکواس کرنے والا ہو گیا

ہوں۔ وقار اور تمکنت کے آداب سے بھی خارج یعنی باہر ہوگیا ہوں۔ثانی الذکر شعر میں غالب اپنے قلم سے کہتے ہیں کہ اے بکواس لکھنے والے قلم! تو لاحول کا تعویذ لکھ، تا کہ شیطان تجھ سے دور بھاگ جائے۔اس کے بعد وہ اپنی طبیعت سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ تو اپنی زبان پر یا علی کا وظیفہ جاری کر لے تا کہ وسوسے تجھ سے دور بھاگ جائیں۔

گریز کے دونوں اشعار غالب کے کمال فن کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔تشبیب سے مدح کی جانب آنے کے لیے غالب نے ان دونوں اشعار کو کچھ یوں پیش کیا ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتوں باتوں میں فطری طور پر ممدوح کا ذکر آ گیا اور اب اس کی مدح ناگزیر ہے۔چنانچہ قصیدہ کے تیرہویں شعر سے غالب حضرت علی کی مدح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

تیرہویں شعر میں غالب نے حضرت علی کی چار صفتیں بیان کی ہیں۔اول، حضر علی کی ذات خدا کے فیوض و برکات کی مظہر ہے۔دوم، وہ آخری رسول یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عزیز ہیں گویا ان کی جان اور ان کے دل ہیں۔سوم، حضرت علی کو خاندان نبوت میں وہ مرکزیت حاصل ہے جو قبلے کو ہوتی ہے۔یعنی وہ آل نبی میں سب سے نمایاں اور مقدس شخصیت ہیں۔چہارم، انھیں دیکھ کر ایمان و یقین میں ٹھیک اسی طرح اضافہ ہوتا ہے جس طرح خانۂ کعبہ کو دیکھ کر ہمارا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

چودھویں شعر میں غالب نے حضرت علی کو ایجاد کا سرمایہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ زمین کے جس حصے پر وہ اپنے قدم رکھتے ہیں، وہاں کی مٹی ایک نئی زمین کی تصویر کا خاکہ بن جاتی ہے۔یعنی وہاں سے ایک نئی دنیا وجود میں آ جاتی ہے۔

پندرھویں شعر میں غالب نے کہا ہے کہ حضرت علی کے قدموں کے نشانات جس جگہ اپنا جلوہ دکھا دیں، وہاں کی مٹھی بھر خاک دونوں عالم کی عزت و آبرو کی امین ہو جاتی ہے۔

سولھویں شعر میں غالب نے حسن تعلیل کے پیرائے میں کہا ہے کہ حضرت علی کی کنیت چونکہ ابوتراب ہے اور تراب کے معنی مٹی کے ہوتے ہیں اس لیے زمین کو حضرت علی سے ایک خاص نوع کی نسبت حاصل ہے۔نتیجتاً زمین کو ایسا رتبہ حاصل ہو گیا ہے کہ آسمان کی پیٹھ ہمیشہ زمین کی ناز برداری کے لیے جھکی رہتی ہے۔

سترہویں شعر میں غالب نے کہا ہے کہ یہ حضرت علی کے اخلاق کا فیض ہے کہ پھول کی خوشبو سے باد صبا معطر رہتی ہے۔یعنی پھولوں کی خوشبو سے بادصبا اگر خوشبودار بنتی ہے تو اس کی اصل وجہ حضرت علی کا اخلاق ہے۔

اٹھارہویں شعر میں حضرت علی کے تلوار کی تعریف کی گئی ہے۔اس حوالے سے غالب کہتے ہیں کہ ساری دنیا میں حضرت علی کے تلوار کی تیزی اور کاٹ کا چرچا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے دنیا

کے وجود کا دھاگا کٹ جائے یعنی دنیا فنا ہو جائے۔

انیسویں شعر میں حضرت علی کے جلوے کو کفر مٹانے والا قرار دیا گیا ہے جس سے چین کے بت خانے کی رونق بھی رنگ عاشق کی طرح ٹوٹ جاتی یا ختم ہو جاتی ہے۔

تیرہویں شعر سے انیسویں شعر تک غالب نے اپنے ممدوح کی تعریف صیغۂ غائب میں کی ہے۔یعنی یہ اشعار مدح غائب سے تعلق رکھتے ہیں۔بیسویں شعر سے وہ ممدوح کی تعریف صیغۂ حاضر میں کرتے ہیں جسے مدح حاضر کہا جاتا ہے۔چنانچہ غالب کہتے ہیں کہ اے ہم سب کی جانوں کی پناہ گاہ! اے ہمارے دل و جان کو فیض پہنچانے والے! اے ہمارے آقا اور بادشاہ! ہم اپنے ایمان و یقین کے فتوے کے مطابق آپ کو ختم رسل یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین مانتے ہیں۔

اکیسویں شعر میں کہتے ہیں کہ آپ کا جسم ایسا پاکیزہ ہے کہ حضور پاک کے کندھے منبر بن گئے ہیں اور آپ کی عظمت کا یہ حال ہے کہ آپ کے بلند نام کے لیے عرش کی پیشانی نگینہ بن گئی ہے۔اس شعر کے ذریعے غالب نے ان دو واقعات کو نظم کرنے کی کوشش ہے جن میں سے پہلا تو یہ ہے کہ حضرت علی نے فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر سوار ہو کر خانۂ کعبہ کو بتوں اور تصویروں سے پاک کیا تھا۔دوسرا یہ کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کے پایے پر حضرت علی کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔

بائیسویں شعر میں ممکن سے مراد وہ تمام مخلوقات ہیں جن کا ہونا اور نہ ہونا دونوں ضروری ہے۔واجب سے مراد وہ ذات پاک جس کا ہونا ضروری ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔اسی طرح آئین باندھنے سے مراد آئینہ بندی یعنی آرائش و زیبائش ہے۔چنانچہ غالب کہتے ہیں کہ آپ کی تعریف اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے ممکن نہیں۔جس طرح شمع کی آرائش و زیبائش شعلۂ شمع کے علاوہ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔

تئیسویں شعر میں غالب کہتے ہیں کہ آپ کے آستانے کا پتھر جو آئینہ کے مانند چمک رہا ہے،اس میں جو باریک لکیریں اور حلقے ہیں اور جنھیں جوہر آئینہ کہتے ہیں وہ درحقیقت حضرت جبریل امین کی غلامی کی تحریر ہے۔یعنی حضرت علی! آپ ایسے عظیم المرتبت ہیں جن کی چوکھٹ پر حضرت جبریل امین بھی جبہ سائی کرتے ہیں۔

چوبیسویں شعر میں غالب کہتے ہیں کہ آپ کے دروازے پر نچھاور کرنے کے لیے جو سامان تیار کیا گیا ہے، وہ جان و دل اور دین جیسی قیمتی چیزیں ہیں جو اللہ نے انسانوں کو عطا کی ہیں۔اس شعر کے ذریعے غالب دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امیروں اور نوابوں کے دروازوں پر سونے چاندی کے سکے لٹائے جاتے ہیں جبکہ آپ کے در پر جان و دل اور عقیدت کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

پچیسویں شعر میں غالب کہتے ہیں کہ اے ممدوح آپ کی تعریف کے لیے تالو اور زبان نہیں بلکہ دل و

جاں کا سہارا لیا جاتا ہے۔اسی طرح آپ کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اور پیشانی نہیں بلکہ لوح محفوظ اور قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔

چھبیسواں شعر مدح کے خاتمے کا شعر ہے۔اس میں غالب کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی تعریف میں جو کچھ بھی کہا ہے، وہ ناقص اور نا تمام ہے۔کیونکہ جو خدا کا ممدوح ہو، اس کی مدح کس سے ہوسکتی ہے۔جس طرح فردوس بریں کی آرائش و زیبائش کسی انسان سے ممکن نہیں، اسی طرح آپ کی تعریف بھی کسی انسان سے نہیں ہوسکتی۔

ان مدحیہ اشعار کے بعد غالب دعا سے پہلے دو اشعار (ستائیسواں اور اٹھائیسواں میں) مدعا یا حسن طلب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔چنانچہ ستائیسویں شعر میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اسد اللہ اسد گناہوں کے بازار کا ایک جنس ہے۔یعنی بہت ہی گنہگار بندہ ہے۔اور آپ کے علاوہ اس کا کوئی خریدار یا پُرسان حال نہیں ہے۔جبکہ اٹھائیسویں شعر میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے مطالب و مقاصد کی پیشکش میں اس قدر شوخ ہے کہ گستاخی کر بیٹھتا ہے۔کیونکہ آپ کے فضل و کرم پر اسے بہت زیادہ یقین ہے۔

ان دو اشعار کے بعد غالب دعا کی جانب آتے ہیں اور اُنتیسویں شعر سے دعا کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔اس میں غالب کہتے ہیں کہ میری دعا کو حسن قبولیت کا وہ رتبہ عطا کیا جائے کہ میری دعا کے ہر ہر حرف پر خود قبولیت سو سو بار آمین کہے۔

تیسویں شعر میں غالب یہ تمنا کرتے ہیں کہ میرا سینہ حضرت حسین کے غم سے اس قدر لبریز ہو کہ ہر وقت میرے خون جگر سے میری آنکھیں رنگین رہیں۔یعنی حضرت حسین کے غم میں وہ ہر وقت خون کے آنسو بہاتے رہیں۔

اکتیسویں شعر میں غالب یہ دعا کرتے ہیں کہ میری طبیعت کو دُلدُل کی محبت میں ذوق و شوق کی وہ سرگرمی عطا کی جائے کہ وہ جہاں تک جائے، اس کے قدموں کے نیچے میں اپنی پیشانی بچھاتا جاؤں۔

بتیسویں شعر میں غالب نے چار دعائیں مانگی ہیں۔اول یہ کہ مجھے ایسا دل عطا کیا جائے جو محبت کرنے والا ہو۔دوم، مجھے ایسا سینہ عطا کیا جائے جس کی فضائیں توحید سے معمور ہوں۔سوم، ایسی نگاہ عطا کی جائے جو حق تعالیٰ کے جلوؤں کی پرستش کرنے والی ہو۔چہارم، ایسی سانس اور روح عطا کی جائے جو صداقت کو اختیار کرنے والی ہو۔

تینتیسواں شعر قصیدہ کا آخری شعر ہے جس کا پہلا مصرع تبرّا ہے۔اس میں غالب کہتے ہیں کہ اے ممدوح! آپ کے دشمنوں کے لیے دوزخ کے دھوئیں اور شعلے کے اثرات صرف کیے جائیں۔یعنی آپ کے تمام دشمنان دوزخ میں ڈال دیے جائیں۔جبکہ دوسرے مصرعے میں تولّا کا مضمون باندھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ کے دوستوں کے لیے فردوس بریں کے گل و سنبل کو وقف کر دیا

جائے۔یعنی تمام دوستوں کو جنت کا سب سے اونچا مقام عطا کیا جائے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کا زیر تدریس قصیدہ جس کا عنوان 'قصیدہ در منقبت حضرت علی' ہے، بے حد عمدہ اور کامیاب قصیدہ ہے۔اس کی تشبیب دل آویز، گریز فطری اور پر کشش ہے۔مدح گوئی میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قصیدے کے دیگر اجزا حقیقت کے قریب اور بے حد پُر اثر ہیں۔

9.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ

- قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔بغیر ردیف کے بھی قصیدے لکھے جا سکتے ہیں۔موضوع کے اعتبار سے اس میں کسی کی مدح یا تعریف یا کسی کی ہجو یا برائی کی جاتی ہے۔
- زیر تدریس قصیدہ کا عنوان 'در منقبت حضرت علی' ہے جس میں حضرت علی کی شان میں ان کی شخصیت کے مطابق تعریف کی گئی ہے۔
- زیر تدریس قصیدہ تینتیس اشعار پر مشتمل ہے جس میں غالب نے قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی کو بے حد منطقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
- 'قصیدہ در منقبت حضرت علی' غالب کے بہترین قصائد میں شمار ہوتا ہے۔اس کی تشبیب بے حد دل آویز، گریز فطری اور پر کشش ہے۔چونکہ غالب نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اس لیے مدح کے علاوہ قصیدے کے دیگر اجزا بھی حقیقت سے بے حد قریب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قارئین اس سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

9.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ قصیدہ کسے کہتے ہیں؟

2۔ 'در منقبت حضرت علی' کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ زیر تدریس قصیدہ کا وہ شعر لکھیں جسے تشبیب کہا جاتا ہے۔

4۔ گریز سے کیا مراد ہے؟ زیر تدریس قصیدہ میں شامل گریز کے شعر کو لکھیں۔

5۔ زیر تدریس قصیدہ کس کی تعریف میں لکھا گیا ہے؟

9.8 سوالات کے جوابات

1۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ 'گاڑھا مغز' ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ لفظ قصیدہ، قصد سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہے 'ارادہ کرنا'۔ لیکن اصطلاح میں قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں۔ ردیف کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بغیر ردیف کے بھی قصیدے لکھے جا سکتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں کسی کی مدح یا تعریف یا کسی کی ہجو یا برائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر قصیدہ کے پانچ اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں: تشبیب، گریز، مدح، مدعا اور دعا۔

2۔ 'قصیدہ درمنقبت حضرت علیؑ' کی تشبیب بے حد دل آویز، گریز فطری اور پرکشش ہے۔ قصیدے میں چونکہ حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے اس لیے مدح، مدعا اور دعا کے لیے جن اشعار کو پیش کیا گیا ہے اس میں حقیقی اور فطری انداز حاوی۔ غالب نے اس قصیدے میں برمحل تشبیہات، استعارات، حسن تعلیل، صنعت تضاد اور دیگر شعری لوازمات کا بھرپور اور فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ غالب کے بہترین قصائد میں شمار ہوتا ہے۔ قارئین کے درمیان اس قصیدے کے تئیں ایک خاص نوع کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

3۔ زیر تدریس قصیدے کے ابتدائی دس اشعار غالب نے تشبیب کے طور پر پیش کیے ہیں۔ اس کا دسواں شعر تشبیب کا آخری شعر ہے جو اس طرح ہے ؎

سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں، لیکن
نہ سرو برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

4۔ تشبیب کے بعد قصیدہ نگار مدح کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ وہ براہ راست ممدوح کی تعریف نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے چند ایسے اشعار پیش کرتا ہے جس سے تشبیب اور مدح کے درمیان ایک منطقی ربط پیدا ہو جائے، اسی کو گریز کہا جاتا ہے۔ زیر تدریس قصیدے میں شامل گریز کے یہ شعر ملاحظہ کریں ؎

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آدابِ وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی! عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں

5۔ زیر تدریس قصیدہ حضرت علی کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔

9.9 فرہنگ

لفظ	معنی
دہر	دنیا

خود بیں	اپنے آپ کو دیکھنے والا
تماشا	نظارہ، مشاہدہ
عبرت	سبق حاصل کرنا
ذوق	ذائقہ، لذت، لطف
ہرزہ	بیکار
زیر و بم	آواز کے اتار کو زیر کہتے ہیں اور بلند ہونے کو بم کہتے ہیں
لغو	بیکار
تمکین	ہوشمندی اور فرزانگی
ہمہ	تمام تر
خمیازہ	انگڑائی
عرض صورت	صورت کی پیشکش
پیمانہ	ناپنے کا آلہ، مراد معیار
ذوق تحسیں	تعریف سننے کا شوق
لاف	ڈینگ مارنا
معلوم	معدوم، نہ ہونا
دُرد	تلچھٹ
چہ	کیا
باد بہ دست تسلیم	رضا جوئی کی مٹھی میں ہوا ہے یعنی کچھ نہیں ہے
خاک بہ فرق	خاک بہ سر ہونا یعنی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا
تمکین	تمکنت یعنی اپنے آپ پر فخر اور غرور کرنا
تسلیم	نیازمندی اور خاکساری
شیرازہ	بندھن، وہ ڈور جس سے کسی چیز کو باندھ دیا جائے
زنگار	زنگ، کدورت
کوہکن	فرہاد، خسرو پرویز بادشاہِ ایران کی بیوی شیریں کا ناکام عاشق جس نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے کوہِ بیستوں کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی، لیکن شیریں کی موت کی جھوٹی خبر سن کر اس نے اپنے تیشے سے خودکشی کر لی تھی۔
گُرسنہ	بھوکا
طرب گاہ	عشرت کدہ یعنی محل
گراں	بھاری

آتش خیز	جس سے آگ نکل رہی ہو
دل ہائے حزیں	رنجیدہ دل
سامع	سننے والا
زمزمہ	نغمہ،سُر ،ترانہ
سروبرگ	خیال، پرواہ
ستائش	تعریف
دماغ	برداشت،تاب
نفریں	ملامت،نفرت
ہرزہ سرا	بیہودہ گو، یاوہ گو
عیاذاً باللہ	اللہ کی پناہ
یک قلم	بالکل
نقش	یہاں تعویذ سے مراد ہے
لاحول	نفرت وبیزاری کا کلمہ
خامۂ ہذیاں تحریر	مہمل باتیں لکھنے والا قلم
وسواس قریں	شک وشبہ سے قریب
ختم رُسل	رسولوں کے سلسلے کا اختتام،خاتم النبیین ،مراد پیغمبر اسلام
سرمایۂ ایجاد	دنیا کی پیدائش کا سرمایہ
گرمِ خرام ہونا	چہل قدمی کرنا
کفِ خاک	ایک مٹھی خاک یا مٹی
گردہ	مصور کا خاکہ،سفوف جو مصور استعمال کرتے ہیں
گردۂ تصویر زمیں	زمین کی تصویر کا خاکہ
جلوہ پرداز	جلوہ دکھانے والا یا سنوارنے والا
ناموس	عزت
امین	امانت دار
نسبتِ نام	نام کا تعلق،اشارہ ہے حضرت علی کے ایک نام ابوتراب کی طرف
ابداً	ہمیشہ
خم شدہ	جھکا ہوا
فیضِ خُلق	نیک خوئی کا فائدہ یا کرم
نفسِ بادِ صبا	ہوا کی سانس،مراد ہوا

عطر آگیں	عطر سے بھرا ہوا، خوشبودار
بُرِش	تلوار کی کاٹ
چرچا	شہرت
ایجاد	پیدا کرنا، مراد دنیا
سررشتۂ ایجاد	دنیا کے وجود کا دھاگا یا سلسلہ
رنگ ٹوٹنا/ رونق ٹوٹنا	رنگ اور رونق کا زائل ہونا
بت خانۂ چیں	قدیم زمانے میں چین کا مشہور بت خانہ
جاں پناہا	جان کو پناہ دینے والا
دل وجاں فیض رسانا	دل و جان کو فیض پہنچانے والا
وصی	وصیت کیا ہوا، نائب
اطہر	نہایت پاک
ناصیہ	پیشانی
بغیراز واجب	سوائے ذاتِ واجب یعنی اللہ تعالیٰ کے
شعلۂ شمع	شمع کی آئین بندی یا آرائش اس کا شعلہ ہی کرسکتا ہے
جوہر آئینۂ سنگ	ممدوح کے آئینے کا جوہر یا وہ قوت جس سے آئینے میں عکس دکھائی دیتا ہے
رقم بندگی	مراد حضرت جبریل کی جبیں سائی کے نشان
اسباب نثار آمادہ	وہ چیزیں جو نثار ہونے کے لیے آمادہ ہیں
کام	تالو، حلق، منہ
تسلیم	اطاعت
لوح و قلم	وہ تختی اور قلم جو عرش پر ہیں
بریں	بالا، اونچا
معاصی	گناہگاری
عرض	پیش کرنا
مطالب	مقاصد
گستاخ طلب	مانگنے میں بے ادب یا بیباک
ازبسکہ	چونکہ
حسن قبول	دعا کی قبولیت کا حسن اور خوبی
اجابت	قبولیت

شبیر	حضرت حسین کا ایک نام
لبریز	بھرا ہوا
طبع	طبیعت
الفت	محبت
دُلدُل	حضرت علی کے ایک گھوڑے کا نام
اس سے قدم اور مجھ سے جبیں	اس کا قدم اور میری پیشانی
توحید فضا	جس کی فضا توحید ہو یعنی جو توحید سے معمور ہو
جلوہ پرست	خدایا ممدوح کے جلوے کی پرستار
نفسِ صدق گزیں	صداقت سے معمور سانس، مراد حق گوئی
صَرفِ اعدا	دشمنوں کے مصرف میں
دود	دھواں

9.10 کتب برائے مطالعہ

1۔	ڈاکٹر ابو محمد سحر (مرتب)	انتخاب قصائد اردو مع مقدمہ و حواشی	بھوپال: مکتبۂ ادب، 2012 (پانچواں ایڈیشن)
2۔	ڈاکٹر ابو محمد سحر	اردو میں قصیدہ نگاری	بھوپال: مکتبۂ ادب، 2012 (ساتواں ایڈیشن)
3۔	محمود الٰہی	اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1995
4۔	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	اردو قصیدہ نگاری	علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1995
5۔	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود	علی گڑھ: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2020
6۔	نور الحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007